فلسفۂ حیات کا پر معارف بیان

اپنے وقت کو ضائع نہ ہونے دیں

(خطبہ جمعہ ۲۶ / دسمبر ۱۹۸۶ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیت کریمہ تلاوت کی:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۵﴾ (الجاثیہ: ۲۵)

پھر فرمایا:

قرآن کریم کی یہ آیت جس کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے مادی فلسفہ حیات کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ مادی اقوام یعنی مادہ پرست قومیں خواہ وہ مشرق سے تعلق رکھتی ہوں یا مغرب سے اُن دونوں میں قدر مشترک یہی فلسفۂ زندگی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہے جو ہماری دنیا کی زندگی ہے نَمُوْتُ وَنَحْيَا اس میں ہم مرتے بھی رہتے ہیں اور زندہ بھی ہوتے رہتے ہیں وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ سوائے زمانے کے کوئی طاقت ہمیں مارتی نہیں۔

اور یہ خیال کہ بیرونی ایک طاقت ہے جس کا نام خدا ہے، جو ذوالاقتدار ہے، وہی زندہ بھی

کرتی ہے اور وہی مارتی بھی ہے یونہی ڈھکوسلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَالَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ خود ان کو علم نہیں ہے کہ زندگی اور موت کا فلسفہ ہے کیا، کیوں موت سے زندگی بنتی ہے زندگی سے موت اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ محض ظنی باتیں کر رہے ہیں۔

آج میں نے اس آیت کا مضمون اس لئے موضوع سخن بنایا ہے یعنی اپنے خطاب کے لئے چنا ہے کہ یہ سال ختم ہو رہا ہے اور ایک نئے سال کا آغاز ہونے لگا ہے۔ اس خاص وقت کا اس مضمون سے بھی ایک تعلق ہے لیکن بیشتر اس سے کہ میں وہ تعلق بیان کروں یہاں ایک ضمنی بات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں قرآن کریم نے جو یہ فرمایا وَمَالَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ اس میں احمدی مفکرین اور احمدی سائنس دانوں کے لئے ایک تحقیق کے میدان کی طرف اُنگلی اُٹھائی گئی ہے اور ایک بہت بڑا کھلا تحقیق کا میدان پڑا ہوا ہے جس کی طرف اب تک مغربی اقوام کی نظر نہیں گئی۔ وہ فلسفہ حیات اور فلسفہ موت ہے اس پہلو سے کہ کیا زمانہ خود بخود مار دیتا ہے یا مرنے کا جو اصول ہے وہ کچھ اور ہے، کوئی اور وجوہات ہیں جو موت کے پیچھے کارفرما ہیں اور ان وجوہات میں ایک منظم منصوبہ ہے اور ایک مقصد ہے اس کا۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف ابھی تک دنیا کے کیمسٹ اور فزِ زسٹ اور بیالوجسٹ نے توجہ نہیں کی کیونکہ اس فلسفہ حیات کی پیروی خدا کے تصور کا اس سے پہلے تقاضا کرتی ہے۔ اگر خدا ہے ہی نہیں اور کوئی بیرونی چیز ایسی نہیں ہے جس نے دنیا کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہو تو ایسے عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ سائنس پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کا جنم لینا فی ذاتہٖ بے مقصد بن جاتا ہے کیونکہ اگر کوئی خدا ہے ہی نہیں جس نے اس کائنات کو تنظیم دی ہے، ترتیب دی ہے اس کو درجہ بہ درجہ آگے بڑھایا ہے۔ طبا قاً اس کا قدم ترقی کی طرف بڑھنے کے التزام کئے ہیں اور ایک مقصد کی پیروی کی طرف اسے آگے بڑھایا ہے۔ اگر یہ فلسفہ حیات درست نہیں ہے، اگر یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے تو زندگی کے بعد موت کی وجوہات تلاش کرنا بے معنی ہو جاتا ہے سوائے اس کے کہ وہ فوری وجوہات تلاش کی جائیں جنہیں دور کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ ان کا علم طب خواہ اس کا کوئی نام بھی رکھ لیں اس کا صرف اس حصے سے تعلق ہے کہ فوری طور پر موت کیوں واقع ہوتی ہے لیکن موت کے لئے جو نظام مقرر ہے، ہر چیز کی ایک طبعی عمر مقرر ہے، وہ کیا وجوہات ہیں جن کے نتیجے میں نشو ونما کے پورے سامان موجود ہونے کے باوجود

ایک زندہ چیز ایک عرصے کے بعد لازماً موت کی طرف حرکت کرنا شروع کر دیتی ہے اور ہر زندہ چیز کے لئے ایک عرصہ حیات مقرر ہے اور وہ اسکی جینز میں Coded Message کی شکل میں موجود ہے۔ اس پیغام سے وہ چیز تجاوز کر ہی نہیں سکتی ۔ پابند ہے، غلام ہے اس پیغام کی ۔ یہ جو پہلو ہیں کیوں ایسا ہوا؟ کیوں زندگی کی جو شکل ہے اس کی عمر ایک خاص طبعی عمر ہے جو دوسروں سے اختلاف رکھتی ہے اور اگر وہ طبعی عمر مقرر نہ ہو تو کیا ہو جائے۔ اس پہلو پر تھوڑی سی روشنی سائنس دانوں نے ضرور ڈالی ہے ۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ Insect یعنی وہ جانور جو کیڑے مکوڑے کہلاتے ہیں ہماری اردو زبان میں اُن جانوروں میں، بڑھنے اور پھیلنے کی اتنی قوتیں موجود ہیں کہ اگر اُن کو بغیر کسی روک ٹوک کے آگے بڑھنے دیا جائے تو ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ لازماً چند سالوں کے اندر اندر زندگی کی ہر قسم پر قبضہ کر لیں۔ کیڑی کیوں ایک وقت تک بڑھنے کے بعد رک جاتی ہے وہاں اور پھر آگے بڑھنے کی بجائے وہ موت کی طرف حرکت شروع کر دیتی ہے، پروانے ہیں کئی قسم کے، اسی طرح بے شمار Insects ہیں مختلف قسموں کے ان سب میں بڑھنے کی ایسی طاقتیں موجود ہیں اور ان کا اندرونی نظام اتنا مضبوط ہے کہ وزن کے لحاظ سے سب سے زیادہ طاقتور چیز کیڑی اور اس قسم کے دوسرے جانور ہیں۔ اپنے سے اتنا گنا زیادہ وزن لے کر یہ جانور سیدھا عمودی چھت کی طرف دیوار کے اوپر چل سکتے ہیں کہ انسان اپنے سے دسواں حصہ، ہزاروں حصہ وزن لے کر بھی نہیں چل سکتا بلکہ اپنا وزن لے کر بھی نہیں چل سکتا۔

کوئی دنیا کا جانور اتنا طاقتور نہیں ہے اپنے وزن کی نسبت سے جتنے یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہیں، حشرات الارض بھی کہتے ہیں ان کو اردو میں اور ان کے لئے جو موت کا نظام مقدر ہے وہ ہمارے حیات کے نظام سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ اگر ان کی موت کا نظام مقرر نہ ہوتا تو باقی زندگی کی ہر قسم کے لئے حیات کا بھی کوئی نظام مقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ وجہ کیا ہے کہ جب ان کے پاس غذا پوری موجود ہو موسم اچھے ہوں جن میں ان کی پرورش ہوتی ہے تو خود بخود بڑھتے بڑھتے ایک موقع پر پہنچ کر یہ موت کی طرف حرکت شروع کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ پاگل ہیں جو مذہبی لوگوں کو کہتے ہیں کہ تم بڑے بے وقوف ہو یہ تو زمانہ مارتا ہے۔ اتنی ترقی کے باوجود، علمی ترقی کے باوجود ابھی تک ان کو یہ نہیں پتا لگا کہ زمانہ نہیں مارتا ایک

قانون مقرر ہے اور ہر قانون جو اس سے تعلق رکھنے والا قانون ہے وہ ہر جگہ ایک طرح اثر نہیں دکھا رہا۔ مختلف قوانین کے مجموعے ہیں جو ہر زندگی کی ایک قسم کے لئے الگ الگ مقرر ہیں اور ان کا اجتماعی اثر پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ایک زندگی کی شکل کی عمر اور بن جاتی ہے دوسری کی اور بن جاتی ہے تیسری کی اور بن جاتی ہے۔ اس لئے وہم ہے یہ کہ محض زمانہ مارتا ہے۔

بہر حال اس فلسفہ حیات کے ردّ میں چونکہ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا ہے یہ لوگ جو مادہ پرست قومیں ہیں یہ ان مضامین میں اپنی علمی ترقی کے باوجود غور نہیں کر رہیں۔ اس لئے نہیں کرتیں کہ بنیادی طور پر یہ خدا کی ہستی کی قائل نہیں ہیں۔ فرضی طور پر قائل بھی ہوں مثلاً عیسائی دنیا فرضی طور پر قائل ہے، یہودی دنیا فرضی طور پر قائل ہے لیکن ان کی سائنسیں خدا سے خالی ہیں۔ آپ ساری سائنسز کا مطالعہ کر لیں۔ انفرادی طور پر اگر ایک سائنس دان خدا کی ہستی کو موجبات میں داخل کر دے، محرکات میں داخل کر دے تو فوراً اس کو پاگل کہنا شروع کر دیں گے، اس کی ساری ریسرچ بے معنی ہو جائے گی۔ اگر وہ یہ تیسرا فیکٹر یعنی خدا کا فیکٹر ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ایولوشن Evolution کے اوپر جو نئے نظریات آ کر ایک مقام پر پھنس گئے ہیں اُس میں خدا کا فیکٹر ڈالے بغیر بات آگے بنتی ہی نہیں ہے اور اس کے لئے یہ قومیں تیار نہیں ہیں۔ اس لئے لاینحل کے طور پر ان مسائل کو رہنے دیتی ہیں لیکن یہ سوچ کر آگے قدم نہیں بڑھاتیں کہ اگر خدا ہو تو یہ ہونا چاہئے۔ تو اسی لئے قرآن کریم نے ایک نہایت ہی عمدہ بنیادی مسئلے کی طرف ہماری توجہ دلا دی کہ ہر تحقیق کے میدان میں جہاں ایک مقام پر پہنچ کر خدا کی ہستی کو تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے آگے یہ قومیں قدم نہیں اُٹھائیں گی اس سے آگے مومنوں کا کام ہے اور مومن سائنسدانوں کے لئے یہ سارے میدان کھلے پڑے ہیں۔ ان میں ایک یہ میدان ہے کہ موت کا نظام ہے کیا؟ کون سے محرکات، کون سے موجبات ہیں جو ہر زندگی کی شکل کے لئے خاص موت کا پیغام رکھتے ہیں اور ان کا آپس میں پھر کیا تعلق ہے۔ اگر کسی خاص قسم کی زندگی کے لئے خاص عرصہ حیات یا موت کا آنا مقدر نہ ہوتا تو باقیوں پر اس کا کیا اثر پڑتا یہ پہلو ہے جو بہت بڑا عظیم الشان علم کا میدان ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے تو احمدی سائنس دانوں کو اس پر کام کرنا چاہئے۔

اس مضمون کا آج کے خطبہ سے جو تعلق ہے وہ یہ ہے کہ سال کے آخر پر انسان یہ سوچتا ہے

ہر قسم کے دائرۂ زندگی سے تعلق رکھنے والا انسان یہ سوچتا ہے کہ میری عمر کا ایک معین عرصہ ختم ہو رہا ہے اور اسی قسم کا ایک معین عرصہ سامنے کھڑا ہے اگر خدا توفیق دے بعض لوگ تو خدا کا نام بھی نہیں لیتے مگر ہم بطور مومن کے اس کا ذکر کئے بغیر بات آگے بڑھا نہیں سکتے۔ تو اگر خدا توفیق دے اور ہم اس حصے میں قدم رکھیں تو کیا ہوگا۔ ہمیں یہ سال کس طرح ختم کرنا چاہئے اور آئندہ زندگی کا آغاز کیسے کرنا چاہئے۔ ایک طالب علم جب اس پر غور کرتا ہے تو اس کا سال دسمبر میں ختم نہیں ہوتا اور جنوری میں شروع نہیں ہوتا بلکہ اس کا سال اپنے ایک اور وقت میں شروع ہوتا ہے، ہر طالب علم کا اپنا اپنا سال ہے تو اس وقت کی سوچ خالصۃً علمی ہو جاتی ہے۔ ایک مالی نظام کا سال بھی مختلف وقت میں شروع ہو کر مختلف وقت میں ختم ہو جاتا ہے تو اس کی سوچ بھی ایک خاص دائرہ سے تعلق رکھتی ہے کہ ہم نے اس گزشتہ سال میں کیا کھویا کیوں کھویا کیا پا سکتے تھے جو نہیں پایا ان امور پر بحث اور پھر ہمارے مالی حساب درست بھی ہیں کہ نہیں، اعداد و شمار ٹھیک ہیں یا غلط۔ ایک خاص ہنگامہ آپ دیکھتے ہیں سال کے آخر پر لیکن یہ سال جو ہے جو جنوری سے شروع ہو کر دسمبر میں ختم ہو جاتا ہے یہ سب انسانوں کے لئے مشترک ہے اور اس لحاظ سے ایک عمومی مشترک انسانی ردعمل اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک مادہ پرست قومیں ہیں ان کے ردعمل، ان کی توجہ کا مرکز اس موقع پر جو بنتا ہے ان کا ذکر اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کا مقصد زندگی کا مقصد سوائے عیش و عشرت کے اچھی دلچسپ لذتوں سے بھری ہوئی زندگی گزارنے کے اور کچھ نہیں ہے کیونکہ خدا نہیں ہے۔ اگر خدا ہے تو فرضی ہے چونکہ ہم جوابدہ نہیں ہیں کسی کے سامنے۔ خواہ تصور کی دنیا میں مانیں بھی تب بھی عملاً اگر گہرائی سے ان کے اعمال اور ان کے اخلاق اور ان کے باہمی ایک دوسرے سے سلوک اور غیر قوموں سے سلوک کا مطالعہ کریں تو یہی جواب ملے گا کہ جس خدا پر یہ ایمان رکھتے ہیں وہ سنجیدگی سے اس کو جواب لینے والا خدا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ان کی تمام تر توجہات زندگی کی لذتوں کے حصول کی طرف ہو جاتی ہیں۔ ان کی ساری ایجادات کا رُخ اسی طرف ہے۔ جہاں تک تخریبی ایجادات ہیں ان کی وجہ اپنے عیش کی زندگی کی حفاظت ہے چنانچہ جس کو آپ دفاعی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایجادات کہہ سکتے ہیں ان سب کا تعلق بھی عملاً اسی زندگی کی حفاظت کے لئے ہے جو ان کو زندگی میں غیر قوموں پر برتری حاصل ہو چکی ہے۔ عیش و عشرت کے زیادہ سامان اکٹھے ہو چکے ہیں۔ چونکہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ تقسیم ہو جائیں سب

دنیا میں اور ساری دنیا ان سے برابر استفادہ کر سکے اسلئے دفاعی نظام ہے۔ کسی کے پاس کھانا زیادہ ہوگا اور دوسرے کے پاس کم ہوگا تو دفاعی نظام ضرور بنانا پڑے گا۔ اگر دونوں کے پاس برابر کھانا ہو تو احمق ہوگا کوئی جو دفاعی نظام قائم کرے گا۔

آخری خلاصہ اس ساری زندگی کی جدوجہد کا یہ ہے کہ بعض قومیں اپنے عیش وعشرت کے نظام میں آگے بڑھی ہوئی ہیں بعض پیچھے ہیں بعض بالکل سامان خورونوش سے عاری ہیں بے چاری۔ ان کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں اس لئے کئی قسم کے خطرات ہیں ایک دوسرے سے چھیننے کے اگر موقع ملے تو اس لئے ایک دفاعی نظام ہے۔

دوسرا نظام ہے ایجادات کا جو خالصۃً لذتوں کو آگے بڑھانے والا نظام ہے اور کوئی بھی اس کا مقصد نہیں۔ اخروی دنیا سے تعلق رکھنے والا کوئی عملی نظام ایسا آپ کو اس دنیا میں نظر نہیں آئے گا جس میں ایک انسان کی سوچ کا ماحاصل اس لئے خرچ ہو رہا ہو کہ ہم اپنی آخری زندگی کو بعد میں آنے والی زندگی کو سدھاریں اور اس کو سنوارنے کا انتظام کریں۔ ٹیلی وژن دیکھ لیں آپ یہاں کے، یہاں کے ریڈیو دیکھ لیں، یہاں کھانے پینے کے سامان، یہاں موٹر گاڑیاں، یہاں کی موٹر اور ایجادات کے جتنے بھی نقشے ہیں ویڈیو وغیرہ یہ سارے ایک ہی سمت میں حرکت کر رہے ہیں اور یہاں تک حالت پہنچ گئی ہے کہ اگر ان کی ساری انکم ساری آمد جو ہے سارے سال کی اس کا آپ تجزیہ کریں تو ان کے زندہ رہنے کے لئے جو ضروری چیزیں ہیں ان پر کل آمد کا 1/10 بھی خرچ نہیں ہوتا بلکہ بعض ملکوں میں 1/100 بھی خرچ نہیں ہوتا۔ شریفانہ زندگی بسر کرنے کے لئے جتنی ضرورت ہے دولت کی اس سے بہت تھوڑا حصہ ہے جو یہ کماتے ہیں، اس کا بہت تھوڑا حصہ ہے جو یہ خرچ کرتے ہیں یا ان کے لئے کرنا ضروری ہے۔ بھاری روپے کی اکثریت آمد کی بھاری اکثریت انہی چیزوں میں خرچ ہو رہی ہے اور جو غریب ہیں، جو نسبتاً غریب طبقے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مکانوں سے اس لئے محروم ہیں جائیدادوں سے اس لئے محروم ہیں، بہت سی بنیادی ضرورتوں سے اسلئے محروم ہیں کہ عیش وعشرت کی طرف توجہ بہت زیادہ مبذول ہو چکی ہے اور بظاہر آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس تو رہنے کے مکان نہیں ہیں، گورنمنٹ مکان دے رہی ہے یا کرائے پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن اگر آپ عملاً ان کی آمدنوں کا، خاندانوں سے نسلاً بعد نسلٍ جائزہ لے کر دیکھیں تو پتہ یہ لگے گا کہ آمد کا بیشتر حصہ جو بچتا ہے

روٹی کے بعد وہ تو شراب میں غرق ہو جاتا ہے یا ایسی دلچسپیوں میں غرق ہوتا ہے جن کے بغیر زندگی ممکن ہے بلکہ اچھی بھلی زندگی کٹ سکتی ہے۔ اس وجہ سے ان کا سال کا آخر بھی یہیں پر آ کر، اسی مرکزی نقطہ پر آ کر ختم ہوتا ہے کہ شرابیں جو ہم پہلے نہیں پی سکے تھے وہ اب پی جائیں۔ جو عیش وعشرت پہلے نہیں کر سکے تھے وہ اب کر جائیں۔ سال ختم ہو رہا ہے اس سال کو ہم شرابوں میں غرق کر دیں اور ڈبو دیں۔

چنانچہ جتنا خرچ کرسمس کے دنوں میں یا جن علاقوں میں عیسائی نہیں ہیں اور مادہ پرست قومیں ہیں، وہ کرسمس کے بغیر بھی دسمبر میں شراب پر خرچ ہوتا ہے اتنا شاذ کے طور پر کسی اور مہینہ میں خرچ ہوتا ہو یا پھر جنوری کی پہلی تاریخ میں ہوتا ہے یعنی نئے سال کا آغاز۔ تو جن کا فلسفہ حیات یہ ہے کہ یہی دنیا ہے اسی میں ہم نے زندہ رہنا ہے، اسی میں مر جانا ہے، کوئی جواب طلبی نہیں ہے۔ ان کے سال کا آخر بھی شراب میں غرق ہو جاتا ہے، ان کے سال کا آغاز بھی شراب میں غرق ہو جاتا ہے اور تعجب کی بات ہے جہاں تک کرسمس کا تعلق ہے ایک نبی کی پیدائش کہا جاتا ہے کہ اس دن ہوئی اور ان قوموں کے نزدیک اس دن خدا کے اکلوتے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ اُس دن کو یہ اس طرح مناتے ہیں کہ اس دن اتنی شراب پیتے ہیں کہ کبھی بعض لوگ مہینوں میں اتنی شراب نہیں پیتے ہوں گے جتنی اس دن پی جاتی ہے یعنی نہ پینے والے بھی پیتے ہیں اس دن۔

ہم چند دن ہوئے ایک مارکیٹ میں گئے دو تین دن پہلے کی بات ہے آخری دن تھا شاپنگ کا کرسمس سے پہلے کا ہم نے کچھ چیزیں خریدنی تھی۔ تو تعجب سے میرے بچوں نے دیکھ کے مجھے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ان کا جو سٹاک اکٹھا کر رہے ہیں، زیادہ شراب ہی اکٹھی کر رہے ہیں یعنی تین چار دن کے لئے ٹرالیاں بھری ہوئی تھیں بوتلوں سے۔

تو سوال یہ ہے کہ اس موقع پر ایک احمدی کو کیا سوچنا چاہئے اور اسے کس طرح یہ آخری دن گزارنے چاہئیں ہمارا فلسفہ حیات تو یہ نہیں ہے مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ کہ ہم تو دنیا میں از خود زندہ ہوتے ہیں اور مرتے ہیں اور زمانہ ہی ہمیں مارتا ہے ہمارا کوئی کوشش کرنے والا خدا نہیں ہے، کوئی پیدا کرنے والا خدا نہیں ہے۔ کوئی مارنے والا خدا نہیں ہے۔ ہمارا نظریہ حیات تو اس سے بالکل برعکس ہے۔ اسلئے سال کا آخر ہمیں کس طرح

صرف کرنا چاہئے اور سال کا آغاز ہمیں کس طرح شروع کرنا چاہئے۔ میں نے شروع میں مثال دی تھی کہ جو خاص ایسے طبقے کے لوگ ہیں جو خاص کسی مضمون سے تعلق رکھنے والے ہیں ان کا جب سال ختم ہو رہا ہوتا ہے تو وہ شرابیں پی کے ختم نہیں کرتے یا سال شروع ہوتا ہے تو شرابیں پی کے شروع نہیں کرتے بلکہ بڑا ایک معنی خیز انجام ہو رہا ہوتا ہے اس سال کا۔ ایک اکاؤنٹنٹ ہے اس کا سال جب ختم ہو رہا ہوتا ہے تو اسے بعض دفعہ گھر آنے کی بھی فرصت نہیں ملتی دفتر سے، اپنے حسابات کی چھان بین کر رہا ہوتا ہے۔ ایک طالب علم ہے اگر سارا سال اس نے نہ بھی پڑھا ہو تو ان چند دنوں میں راتیں جاگ کر گزار رہا ہوتا ہے اور سال کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ دوبارہ کتابیں ٹھیک کرتے ہیں، غلطیاں اپنی دیکھ کر ان سے استفادہ کرتے ہیں کہ آئندہ یہ غلطیاں نہ دہرائی جائیں، حروف کے کالم درست ہوں، ہندسوں کے کالم درست ہوں، کتابوں پر بچے ورک چڑھاتے ہیں، کاپیاں بناتے ہیں نئی۔ تو جہاں تک سنجیدہ لوگوں کے سالوں کے آغاز یا انجام کا تعلق ہے جو سنجیدہ مضامین سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں ان کا طبعی فطری ردعمل تو یہ ہوتا ہے۔

اس لئے دسمبر کا مہینہ جماعت احمدیہ کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس اہمیت کو اللہ تعالیٰ نے از خود ہم پر اس طرح روشن کر دیا بغیر ہماری کسی سکیم کے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رہنمائی فرمائی کہ دسمبر ۲۶، ۲۷، ۲۸ تین تاریخوں میں سالانہ مذہبی اجتماع کیا کریں۔ چنانچہ یہ وقت جو آج چھبیس ۲۶ ہے ۲۶ سے کچھ پہلے اور ۲۸ کے کچھ بعد تک ساری جماعت احمدیہ کی توجہ روحانی اور دینی اور علمی امور کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔ کچھ خدا کی خاطر سفر کر رہے ہوتے ہیں، کچھ خدا کی خاطر سفر سے آنے والوں کے لئے تیاریاں کر رہے ہوتے ہیں، کچھ علماء تقریریں تیار کر رہے ہوتے ہیں، کچھ سننے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک عجیب ماحول ان دنوں میں قادیان میں ہوا کرتا تھا اور ربوہ میں بھی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری جماعت کسی مقتدر اور مدبر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اتفاقاً پیدا ہونے والی جماعت نہیں ہے یعنی انسان کی زندگی جس طرح نہ اتفاقاً پیدا ہوئی نہ اتفاقاً ختم ہوگی اسی طرح جماعت احمدیہ کی باگ دوڑ بھی اور جماعت احمدیہ کا نظام حیات اور نظام ممات بھی ایک مقتدر، کارساز ہستی کے ہاتھوں میں ہے اور اس نے ہمیں از خود ان رستوں پر چلا دیا ہے جن رستوں پر باشعور اور بالغ نظر قومیں چلا کرتی ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنے موت

کے نظام سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے اور اس پر بھی غور کرتے رہنا چاہئے۔ ہمارے لئے بھی ایک موت کا نظام مقدر ہے اور وہ اسباب وہی ہیں جو پہلی قوموں کی موت کے اسباب بنا کرتے تھے۔ ان پر بھی غور ضروری ہے، ہم یہ تو نہیں کہتے کہ یہ ساری فرضی باتیں ہیں اس لئے قرآن کریم کے فیصلے کے نیچے نہیں آنی چاہئیں اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ کہ محض فرضی ڈھکوسلے بنا رہے ہیں یہ لوگ، ان کو کچھ بھی حقیقت حال کا علم نہیں۔

جماعت احمدیہ کا اندرونی نظام شہادت دے رہا ہے کہ اس جماعت کے قیام کا ایک مقصد ہے، ایک خاص رخ ہے۔ خاص ترتیب سے یہ جماعت قائم فرمائی گئی ہے اور اعلیٰ مقاصد کی پیروی کے لئے خدا تعالیٰ کے فرشتے اس کو جیسے ہانک کر لے جاتے ہیں اس طرح باندھ کر ایک خاص مقصد کی طرف، ایک خاص رخ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تو جہاں حیات کا ایسا اعلیٰ نظام موجود ہے وہاں اس خیال سے غافل ہو جانا کہ موت کا بھی نظام ہوگا، یہ بڑی بے وقوفی ہوگی۔ جو قومیں زندہ کی جاتی ہیں جن کو ارتقاء کے رستے پر چلایا جاتا ہے، ان کے موت کے بھی اسباب مقدر ہوتے ہیں اور معین ہوتے ہیں اور قرآن کریم نے ان اسباب پر کثرت سے روشنی ڈالی ہے۔ ان میں کچھ اسباب یہاں آپ آج دیکھ رہے ہیں یعنی مغربی دنیا میں بسنے والے، یا مشرقی دنیا میں مادہ پرست قوموں میں بسنے والے، جاپان میں بھی دیکھ رہے ہوں گے، دوسری قوموں میں بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ان کی زندگی کا مقصد سوائے دنیا طلبی کے اور عیش پرستی کے اور کچھ بھی نہیں۔

اگر ہمارا یہ مقصد نہیں ہے تو پھر ہمارا مقصد کیا ہے ہم نے کس حد تک اس کی پیروی کی؟ کس حد تک اس سال میں اس کی پیروی سے غافل رہے؟ کون سے موجبات ہیں جو ہمیں پیروی سے غافل رکھنے میں عمل پیرا ہیں؟ کون سے ایسے محرکات ہیں جن کے نتیجے میں ہم پہلے سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں؟ یہ سارا جائزہ ہونا چاہئے۔ یہ جائزے انفرادی بھی ہونے چاہئیں اور اجتماعی بھی ہونے چاہئیں۔ جہاں تک اجتماعی جائزوں کا تعلق ہے آج سے لے کر سال کے آخر تک مجالس عاملہ اس موضوع پر بیٹھیں ساری دنیا میں کہ ہم نے اس سال میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔ ہم سے کیا ایسی غلطیاں ہوئیں جو وہ قومیں کیا کرتی ہیں جن کا قدم موت کی طرف روانہ ہو۔ کون سے ہم نے ایسے اچھے کام کئے جو زندہ قوموں کے اسلوب ہوا کرتے ہیں اور کس طرح اُن

غلطیوں سے بچنا چاہئے اور کس طرح ان اچھی باتوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ کرنی چاہئے۔

جماعت کی کل تعداد کا جائزہ لینا، جو تحریکات خلفاء نے کی ہیں جو آج کل جاری ہیں خواہ وہ پہلے خلفاء نے کی ہوں یا موجودہ خلیفہ نے کی ہوں، جو اس وقت واجب العمل ہیں۔ ان تحریکات کا جائزہ لینا، ان سے کس حد تک استفادہ ہوا، کس حد تک ہم نے ان کو فراموش کر دیا اور اس حوالے سے آئندہ سال کا ایک معین پروگرام مرتب کرنا۔ یہ ہے ایک زندہ باشعور قوم کا ردّعمل سال کے اختتام پر اور سال کے آغاز پر اس کو پھر آگے رائج کرنا اس پروگرام کو اور بڑی ہمت اور محنت اور توجہ اور دعا کے ساتھ یہ کوشش کرتے چلے جانا کہ یہ پروگرام صرف فرض کی دنیا میں خیالی دنیا میں نہ رہے، تصورات کی دنیا میں نہ رہے بلکہ عمل کی دنیا میں ڈھل جائے۔ یہ ہے ایک باشعور زندہ قوم کا کام۔

جہاں تک انفرادی تعلق ہے ہر شخص کا اپنے نفس کا محاسبہ الگ الگ ہوگا۔ کئی ایسے دوست ہوں گے جنہوں نے گزشتہ سال اس طرح شروع کیا غفلت کی حالت میں کہ کوئی نیک ارادہ باندھا ہی نہیں۔ وہ بھی اس حرکت کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر حرکت رہے ہیں جو مادہ پرست قوموں کا پلیٹ فارم ہے۔ ازخود وہ ایک سال سے دوسرے سال میں داخل ہو جاتے ہیں، ان کو پتہ ہی نہیں کہ ان کا رخ کس طرف ہے۔ ایسے لوگوں تک اگر میری آواز پہنچے تو اُن کو اگلے سال کا آغاز کرنے سے پہلے اپنے اس سال کا اس نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا چاہئے کہ سارا سال کون سی ایسی بدیاں تھیں جن سے وہ غافل رہے ہیں، کون سی ایسی نیکیاں تھیں جنہیں وہ اختیار کر سکتے تھے لیکن نہیں کیں، نظام جماعت میں ان کا کیا مقام ہے؟ خدمت کے کون سے مواقع تھے جو انہوں نے ضائع کئے ہیں۔ کس حد تک وہ تحریکات پر عمل کرتے ہیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں؟ کس حد تک اُن کا وجود جماعت کے لئے مفید ہے اور غیروں کے لئے مفید ہے؟ کس حد تک وہ بنی نوع انسان کو اللہ کی طرف بلانے میں کامیاب رہے ہیں یا اپنی اولاد کو خدا کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے جب آپ جائزہ لیں گے تو جیسا کہ مَیں نے بیان کیا ہے مختلف افراد کا انفرادی طور پر الگ الگ جائزہ ہوگا اور الگ الگ جواب ہوں گے اور اس کے متعلق ایک ہی کوئی جواب ایسا پیش کیا ہی نہیں جا سکتا جو سب کے لئے یکساں ہو۔ فرد فرد سے اس کے بدلتے ہوئے حالات کے نتیجے میں مختلف قسم کے سوال ہونے چاہئیں اور اگر وہ سب سوالات خود اُٹھائے اپنے اوپر تو اس کے جواب بھی مختلف ہوں گے لیکن

جس امر کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ ایک سوال ہے جو سب کے لئے مشترک ہے کہ کس حد تک ہم نے اپنے وقت کو ضائع کیا اور کس حد تک ہم نے اپنے وقت کی بالا رادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کی۔ اگر اس سوال کو ہم ہر ایک سے پوچھیں یا ہر ایک اپنے آپ سے پوچھے تو حیران ہوگا یہ جواب پا کر اپنے نفس سے کہ میں نے اپنے وقت کی قیمت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ میرے وقت کی ایک قیمت ہے سوائے اس قیمت کے جو اپنے پروفیشن میں، اپنے شعبے میں مجھے خود بخود ملتی ہے، وہ قیمت تو بالکل اور چیز ہے میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جو انسان کا اپنا وقت ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کا ڈاکٹری سے فارغ ہونے کے بعد، طالب علم کا کتابوں کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد وغیرہ وغیرہ۔

اس پہلو سے ہم جائزہ لیتے ہیں تو عموماً ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ ہم اپنے وقت کا اکثر حصہ یعنی بچے ہوئے وقت کا جس پر ہمارا اختیار تھا ضائع کر دیتے ہیں اور نیک مقاصد پر ان کو استعمال نہیں کرتے۔ یہ ضیاع مختلف جگہوں پر مختلف شکل میں ہو رہا ہے۔ پسماندہ اقوام میں یہ ضیاع زیادہ تر گپیں مار کر ہو رہا ہے اور کچھ نہیں بس چلتا ان کا تو پھر وہ آپس میں بیٹھ جاتے ہیں بازاروں پر، گلیوں کے کونوں میں جن کو خدا نے توفیق دی ہے گھروں میں، اپنے گھروں میں یا کسی دوسرے کے گھر میں جا کر اور وہ ان گپوں میں بیٹھے مصروف رہتے ہیں، کسی طرح ان کا وقت ٹلتا ہی نہیں وہ کیا کریں بے چارے۔ وقت گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب کرنی پڑتی ہے۔ مجالس لگاتے ہیں ایک دوسرے کے گھر پر جا کر اور بچوں کو بھی وقت کے ضائع کرنے کی عادت ڈالتے ہیں اور مادہ پرست قوموں میں بسنے والے احمدی خاندانوں میں سے بھی ایک طبقہ ایسا ہے چونکہ وہ دوسرے گندے کاموں میں نہیں پڑتے اس لئے نسبتاً کم گندے کام میں پڑتے ہیں یعنی وقت کا ضائع کرنا وہ سمجھتے ہیں کہ گندہ کام ہی نہیں ہے چونکہ ہم نے شرابیں نہیں پینی چونکہ ہم نے ڈانسنگ ہالز میں نہیں جانا اور سوشل کالز اس قسم کی نہیں کرنی جن میں گندگی میں ملوث ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے بہتر اور کیا وقت کا مصرف ہے کہ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں جائیں اور باتیں کریں اور گپیں ماریں اور چغلیاں کریں اور حالات کا جائزہ لیں، کھیلوں پر تبصرے کریں اور پھر تھکے ماندے گھر واپس آجائیں اور پیچھے بھی لوگوں کو تھکا ہوا چھوڑ آئیں پھر دوسرے دن صبح نماز کے لئے نہ کسی سے اُٹھا

جائے، بچوں کو سکول سے دیر ہو رہی ہو، بڑی مشکل سے بے چاری مائیں اُٹھیں اور ان کو تیار کریں۔ ایک مصیبت کا چکر ہے جو ہر وقت، قریباً ہر روز ہی ایسے لوگوں کے سامنے رہتا ہے اس چکر میں پڑے رہتے ہیں وہ بے چارے۔

ایک حصہ اس میں سے ایسا ہے جس کو Unavoidable کہہ سکتے ہیں چونکہ تھکے ہوئے آدمی نے لازماً اپنی فرحت کا بھی کچھ سامان کرنا ہے، ایک سوشل آدمی نے اپنے تعلقات بھی قائم رکھنے ہیں اس پہلو سے تو یہ چیز نہایت ہی مفید ہے اور انسان کے فرائض میں بھی داخل ہو جاتی ہے لیکن جب ہم ملنے جاتے ہیں تو وہاں موضوع سخن کیا ہے یہ ایک بڑی اہم بات ہے۔ ملنے تو جانا ہے اور لوگوں نے ملنے آنا بھی ہے، اس وقت ہم کیا باتیں کرتے ہیں؟ کیا خدا کی بات کرتے ہیں؟ کیا دین کی بات کرتے ہیں؟ کیا مادہ پرست لوگوں پر ایسا تبصرہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے بچوں کی رہنمائی ہو؟ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلقات کی باتیں کرتے ہیں؟ کیا نیک لوگوں کی سیرت کا ذکر چلتا ہے؟ کیا دعاؤں کی قبولیت کا ذکر چلتا ہے؟ کیا ایسے مسائل کا ذکر چلتا ہے جن سے بچنا ہماری اگلی نسلوں کے لئے ضروری ہے۔ اگر یہ سارے ذکر چلتے ہوں تو تفریح بھی ہو جاتی ہے اور اس وقت کا بہترین مصرف بھی ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ تو ناممکن ہے کہ ہم جائزہ لینے کے بعد یہ کہیں کہ آئندہ سے بالکل ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیا جائے۔ ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھ جائے اور ہر شخص اپنے گھر کے ہر کمرے میں بند ہو کے بیٹھ جائے۔ یہ تو ناممکن ہے لیکن وقت کا جو بھی مصرف ہے اس میں اچھا بھی ہے اور برا بھی ہے۔ اچھا مصرف اختیار کرنا چاہئے۔

اس کا جائزہ آپ لیں کہ گزشتہ سال جو آپ نے بہت سا وقت ضائع کیا اور اپنی اگلی نسلوں کو بھی ایسی سمت میں دھکیلا ہے جہاں سے بعد میں آپ ان کو بلانا بھی چاہیں گے تو نہیں آسکیں گے واپس۔ اس کی بجائے آئندہ ایک باشعور بالغ نظر قوم کے انداز میں اپنے وقت کا جائزہ لیں اور آئندہ کے لئے بہتر پروگرام بنائیں۔

دوسرا حصہ جو وقت کے ضیاع کا ہے وہ اس وقت کی سب سے بڑی لعنت ٹیلی وژن ہے۔ ٹیلی وژن میں اتنا وقت ضائع ہوتا ہے کہ اگر ضائع ہونے والے وقت کا اندازہ کریں تو آپ حیران ہو جائیں گے کہ یہ مغربی قومیں بھی عموماً مصروف کہلاتی ہیں، جو عموماً اپنے وقت کی قیمت

وصول کرنا جانتی ہیں ان کا ایک جائزہ میرے علم میں آیا ہے کہ تقریباً روزانہ ایک ہاؤس وائف (House Wife) 5 گھنٹے ٹیلی وژن پر ضائع کرتی ہے۔ اگر یہ جائزہ درست ہے، اگر درست سو فیصدی نہ بھی ہو تو تین گھنٹے بھی سمجھ لیں۔ تو تین گھنٹے ٹیلی وژن کے ساتھ بندھنا ایک بہت ہی بھاری وقت کی قربانی ہے۔ لیکن صرف یہ بات نہیں ہے اس کے اندر اور بھی ایسے خطرات ہیں جن کی طرف خصوصاً امیر ملکوں میں بسنے والے احمدیوں کو متوجہ کرنا ضروری ہے۔

ٹیلی وژن ایک دلچسپ چیز ہے یعنی دلچسپ ہو سکتی ہے کئی پہلوؤں سے۔ اس میں علمی پروگرام بھی ہوتے ہیں اس میں کہانیاں بھی ہوتی ہیں جو معصوم ہوں، کارٹون بھی ہوتے ہیں بچوں کے لئے اور تحقیقاتی مضامین بھی ہوتے ہیں، سیاسی مباحث بھی ہوتے ہیں، لیکن بالعموم ان سارے پروگراموں کا رجحان اسی فلسفہ حیات کی طرف ہے جس کا ذکر قرآن نے اس آیت میں فرمایا ہے یعنی جو سنجیدہ باتیں کرتے بھی ہیں وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ لوگ بور نہ ہو جائیں۔ اس لئے اس سے پہلے بھی گندہ پروگرام رکھیں گے فضول، اس کے بعد بھی رکھیں گے بیچ میں اشتہار ہی گندے کر دیں گے اور کچھ نہیں تو عمومی تأثر جو ٹیلی وژن کا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ بچے دن بدن زیادہ پابندیوں اور ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے جرائم ہیں جوان سوسائٹیوں میں بڑھ رہے ہیں جو براہ راست ٹیلی وژن سے سیکھے جاتے ہیں۔ خاص ادائیں ہیں بدمعاشوں کی چلنے کی اور معصوم بچہ جب اس قسم کی اداؤں کو دیکھتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ صحیح فیصلہ کرے کہ ہیرو کون ہے مجھے وہ بننا چاہئے یا ولن بننا چاہئے۔ ایک طبقہ ایسا ہے جن کے ساتھ ماں باپ کے سلوک اچھے نہیں ہیں ان کے اندر رد عمل پایا جاتا ہے اور ہر ایسا بچہ جس کے اندر کوئی نفسیاتی رد عمل پایا جاتا ہے وہ زیادہ اس کے لئے امکان ہے کہ وہ ہیرو کی بجائے ولن یعنی جو نیک انسان کا کردار ہے اس کی بجائے بدمعاش کے کردار کو اختیار کرے اور ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی نسلیں ولن بننے کی طرف زیادہ متوجہ ہوتی چلی جارہی ہیں اور ان کو پتہ نہیں لگ رہا کہ ہم کیوں کر رہے ہیں ایسا اور کیا کر رہے ہیں۔ احمدی بچے بھی جب دیکھیں گے تو ان میں سے بھی جو ایسے گھروں میں ہیں جن کے اندر نفسیاتی توازن نہیں پایا جاتے ان کے اندر کرائم (Crime) کا، جرم کا رجحان بڑھے گا اور جن کے اندر نہیں بھی بڑھے گا اس وجہ سے بعض دوسرے پروگرام براہ راست گندگی سکھانے والے ہیں ان میں سب کا ہی رد عمل

تقریباً ایک جیسا ہی ہوگا اور اس کے لئے کوئی چھان بین نہیں۔ اس کے لئے تمیز کرنے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہے گھروں کے اندر۔ اس لئے بہت حد تک مغرب کے زہر کو آپ اپنی نسلوں میں رائج کرنے کے سامان خرید لیتے ہیں بازار سے اور ان سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعض ایسے مخفی بد اثرات ہیں جو بہت ہی دیرپا اثر کرنے والے نہایت ہی خطرناک اور مہلک ہیں۔ دن بدن جوں جوں ٹیلی وژن کا رواج بڑھتا جارہا ہے مطالعہ کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔ آپ اس دور کا تصور کریں جبکہ ٹیلی وژن موجود نہیں تھے اس وقت ہر روز ایک تعلیم یافتہ آدمی کا جتنا وقت مطالعہ میں خرچ ہوا کرتا تھا آج اس کا دسواں حصہ بھی نہیں خرچ ہوتا۔ پہلے تھکاوٹ کا علاج مطالعہ تھا، اب مطالعہ تھکاوٹ پیدا کرنے کا موجب سمجھا جاتا ہے اور مطالعہ کا علاج ٹیلی وژن ہے۔

دفتر میں کام کرلیا، بچوں نے پڑھائی کر لی، مطالعہ ہو گیا تھک گئے، اب ہمیں ٹیلی وژن دیکھنا چاہئے اور مطالعہ میں اور ٹیلی وژن میں ایک بڑا نمایاں فرق ہے اور فرقوں کے علاوہ وہ فرق یہ ہے کہ مطالعہ اپنے اختیار سے ہوتا ہے اس میں جو چاہیں آپ وہی چیز اُٹھا کے پڑھ سکتے ہیں۔ ٹیلی وژن آپ پر ٹھونسی جاتی ہے اور مضامین کا اختیار غیروں کا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں ہاں ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ہم فرق کر سکتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو کرتے ہیں اور فرق کی گنجائش کہاں تک ہے۔ زمین آسمان کا فرق ہے ٹیلی وژن میں آپ کا اختیار ہی اتنا محدود ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بعض خاندان ٹیلی وژن دیکھ بھی رہے ہیں بور بھی ہو رہے ہیں رات بھی جاگ رہے ہیں اور نہایت ہی بدمزگی کے ساتھ اس طرح پھر سوتے ہیں جا کے جس طرح ایک بدمزہ کھانا کھانے والا پیٹ بھرتا چلا جاتا ہے لیکن سمجھتا ہے کہ پیٹ نہیں بھر رہا زیادہ بھی کھا جاتا ہے تب بھی پیٹ بھرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایسے ٹیلی وژن دیکھنے والے ایسے خاندان ملیں گے جو بیچارے بیٹھے ہوئے ہیں کہ کہیں سے تو لذت ملے ایک پروگرام بدلتے ہیں، دوسرے بدلتے ہیں، چوتھا بدلتے ہیں جہاں چار ہیں اور امریکہ میں تو بیس بیس، پچیس پچیس، چھبیس چھبیس بھی ہیں۔ ان کو سمجھ نہیں آتی کیا کریں، لذت لینا چاہتے ہیں مل نہیں رہی اور تھک ہار کے سارا وقت ضائع کر کے پھر آخر وہ لیٹ جائیں گے پھر صبح نمازوں میں دیر اور پھر عبادتوں میں بد اثرات پڑتے ہیں اس کے، وہ تو لازماً پڑیں گے ہی۔ مطالعہ میں اور اس میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ جوں جوں یہ سہل انگاری پیدا ہو رہی ہے طبیعتوں میں ٹیلی

ویژن کی وجہ سے، ساتھ ساتھ مطالعہ مشکل اور مشکل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ مذہبی مطالعہ تو ایک بہت بڑی مصیبت بن گئی ہے ہماری اگلی نسلوں کے لئے۔ آپ ان کو مذہبی مطالعہ کے لئے کتاب دیں گے تو حیران ہو کر دیکھیں گے کہ یہ کر کیا رہے ہیں یہ کوئی زمانہ ہے، تھکا ہوا میں سکول سے آیا ہوں، اپنی کتابوں سے فارغ ہوا ہوں اب مجھے ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھنے دیں، یہ کہتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب پڑھو فلاں خطبہ سنو یا فلاں خطبہ پڑھو یا یہ مطالعہ کرو یا عیسائیت اور اسلام کا موازنہ کرو۔ اتنی مصیبت بوجھل چیزیں تھوڑا سا پڑھیں گے تو بچے کہیں گے ہمیں سمجھ نہیں آ رہی چھوڑ دیں بس اور ماں باپ بھی زور نہیں دیتے کہ کہیں بچے بالکل ہی ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ خود بے اختیار ہوتے چلے جا رہے ہیں کیونکہ مطالعہ کی عادت نہیں ہے۔ مطالعہ کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے دنیاوی نقصان بھی بے شمار ہو رہے ہیں اور مذہبی اور روحانی اور تمدنی نقصانات تو بے شمار ہیں۔ رفتہ رفتہ انسان چند باشعور شرارت کرنے والوں کے قبضے میں جا رہا ہے بحیثیت مجموعی۔ اس بات کا آپ کو پورا احساس نہیں ہے امریکہ میں بارہا ایسے جائزے ہوتے رہے ہیں جن کے نتیجہ میں یہ بات زیادہ کھل کے سامنے آتی جا رہی ہے کہ دن بدن انسان یعنی امریکہ کا انسان ایسی چند کمپنیوں کے ہاتھ میں جا رہا ہے جو جس طرف چاہیں اس کے دماغ کا رخ بدل دیں۔ یہاں تک کہ امریکن پریذیڈنٹ بھی اپنے آپ کو اس معاملے میں بالکل بے اختیار پا رہے ہیں۔

چند سال ہوئے غالباً پریذیڈنٹ نکسن جو سابق پریذیڈنٹ تھے ان کی کتاب تھی جس کا میں نے مطالعہ کیا انہوں نے اپنے Presidency کے حالات اور بہت سی باتیں اور متعلقہ لکھی تھیں۔ اس میں وہ ضمناً ذکر کرتے ہیں کہ پولیٹکس اب ہمارے ہاتھوں سے نکل کر ان لوگوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے جن کے ہاتھ میں ایسی دولتیں ہیں جن کے ذریعے وہ ٹیلی وژن پر کنٹرول کر رہے ہیں یعنی دولتوں کے مختلف مصارف ہیں، ان میں سے ایک باشعور مصرف یہ ہے کہ ٹیلی وژن اور میڈیا پہ قبضہ کیا جائے اور وہ لوگ اکثر یہود ہیں اور ان کی جو کتابیں بعض پرانی شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ صدی کے آخر پر ہی انہوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ دنیا کو اس طرح عیش وعشرت اور لہو ولعب میں مصروف کر دینا ہے اور ایسی نئی نئی ایجادات کرنی ہیں ان کے لئے لذت طلبی کی کہ وہ جو کچھ کمائیں ساری نعمتیں ان کی عیش وعشرت پر خرچ ہوں اور وہ روپیہ پھر واپس لوٹ کر ہمارے پاس آتا چلا

جائے۔ان کے خیالات کو رُخ دینا،ان کے زندگی کے رُخ خاص سمتوں میں پھیرنا ان باتوں کا اب ٹیلی ویژن کا بڑا بھاری اثر ہو چکا ہے۔چنانچہ اگر مجھے صحیح یاد ہے نکسن کی کتاب تھی تو اس میں یہ درج تھا کہ ٹیلی وژن کے متعلق ہم اتنے بے بس ہو چکے ہیں کہ ہم جو بات کہہ سکتے ہیں اپنے فعل کے جواز میں وہ محدود ہے،ہم ساری قوم کو ان تمام وجوہات سے مطلع کر ہی نہیں سکتے جن کے نتیجے میں ہم نے یہ قدم اُٹھایا ہے ٹیلی وژن پر ایک مبصر آجاتا ہے جس کو پورے حالات کا بھی پتا نہیں اور وہ آکر جس طرح پنجابی میں کہتے ہیں نہ ''پھینٹے خاں بننا'' وہ بہت بھاری آدمی بن کر تبصرے شروع کرتا ہے اور وہ آزاد ہے ہر بات کرنے پر اور ذمہ دار لوگ ہر بات بتانے پر آزاد نہیں ہیں۔نتیجۃً عوام الناس کے خیالات پر وہ اس سے زیادہ اثر پیدا کر جاتا ہے بعض مواقع پر، جتنا ایک سنجیدہ پریذیڈنٹ یونائیٹڈ سٹیٹس (United States) کا اثر کر سکتا ہے اور ڈبیٹ (Debate) میں وہ ہارتا ہے یہاں تک کہ وہ مجبور ہو جاتا ہے غلط پالیساں اختیار کرنے پر۔وہ یہ نتیجہ نکال رہے تھے کہ اتنا خطرناک ہے اور آگے جا کر اتنا خطرناک اور ہو جائے گا کہ کچھ عرصے بعد ہماری حیات وممات چند پروفیشنل ٹیلیوژن چلانے والوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، جس طرف چاہیں ہمارے خیالات کا رخ پھیریں کیونکہ ہم سب ایڈکٹ (Addict) ہو چکے ہیں ٹیلی وژن کے، ٹیلی وژن کے نشے کے غلام بن چکے ہیں۔اس لئے اس نقطہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو رفتہ رفتہ یہ جو چیزیں ہیں، یہ جو بظاہر اعلیٰ مقصد کے لئے ایجادات تھیں، اعلیٰ مقاصد کے لئے نہیں رہیں بلکہ اس مقصد کی پیروی کے لئے ہوگئی ہیں جس کا ذکر قرآن کریم نے فرمایا تھا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا ہمیں کچھ پرواہ نہیں آئندہ زمانے پر کیا بنتی ہے، آئندہ ہماری نسلیں کیا بن کر اُٹھیں گی دنیا کے سامنے، زندہ رہیں گی یا مریں گی کوئی پرواہ نہیں۔زمانہ ہے جو پیدا کرتا ہے، زمانہ ہے جو مارتا چلا جاتا ہے۔آباؤ اجداد کے زمانے سے ہم یہی دیکھتے چلے آرہے ہیں آئندہ بھی ہوتا رہے گا، کوئی رُخ نہیں، کوئی مقصد نہیں۔اس لئے یہ تھوڑی سی زندگی جو ہمیں میسر ہے اس میں جو چاہتے ہو، جس قسم کی عیش چاہتے ہو کرتے چلے جاؤ اور عیش کے حصول کے لئے، لذت طلبی کے لئے ہر دوسری قدر کو قربان کیا جا سکتا ہے، یہ ہے فلسفہ حیات۔اسی لئے جرم بڑھتے ہیں، اس لئے رفتہ رفتہ ٹیلی وژن والے جرائم دکھانے پر مجبور ہوتے چلے جارہے ہیں کیونکہ فلسفہ حیات اس کا مطالبہ کر رہا ہے یہ بات بھول گئے ہیں بعض مبصرین۔

وہ گندی فلمیں اس لئے دکھانے پر مجبور ہیں کہ یہ فلسفہ حیات فطرتاً گند کا مطالبہ کر رہا ہے اور جو ٹیلی وژن گند نہیں دکھائے گا وہ اس دور میں زندہ نہیں رہ سکے گا، اس کو باہر نکال کے پھینک دیا جائے گا اور جو گند ایک دفعہ دکھا دے وہ اسی گند پر قائم رہے ایک دو سال تو وہ بھی اس باہمی دوڑ میں مات کھا کے مر جائے گا کیونکہ ایک گند کے بعد طبیعت سیر ہو جاتی ہے پھر نیا گند دیکھنا چاہتی ہے۔ اس لئے آپ گزشتہ بیس، پچیس سال میں ٹیلی وژن کا جائزہ لے کر دیکھیں تو آپ حیران ہوں گے دیکھ کر کہ اتنی زیادہ بے حیائی کی طرف تیزی سے اب ٹیلی وژن آگے قدم بڑھا رہا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ سب حدیں پھلانگ لے گا اور پھر کچھ بھی نہیں رہے گا۔ ہر قسم کی بے حیائی ہوگی لیکن اس سے بھی لوگ بور ہو جائیں گے۔

پھر وہ ردعمل ہوتا ہے جس کے بعد پاگل پن آتا ہے معاشرے کا، بعض دفعہ Bohemianism اس سے پیدا ہوتا ہے، بعض دفعہ ہپی ازم پیدا ہوتا ہے، بعض دفعہ Drugs Addictioin پیدا ہوتی ہے، بعض دفعہ سارے فلسفہ حیات سے ایمان اُٹھ جاتا ہے، انسان کہتا ہے کیا سولائزیشن، کیا ایٹم بم، کیا یہ کیا وہ، کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ انارکی کی طرف انسان قدم بڑھاتا ہے اور انارکی کی طرف بہت سارے قدم بڑھ چکے ہیں کہ جن سے ان قوموں کی واپسی اب ممکن نہیں رہی اس طرف جا رہے ہیں جہاں ایک اور قانون قدرت جو قومی موت کے لئے ذمہ دار ہے وہ ان کو دھکیلتا ہوا قومی موت کی طرف لے جا رہا ہے اور یہ کہتے ہیں نہیں ہم اتفاقاً ہی پیدا ہوتے ہیں اتفاقاً ہی مر جاتے ہیں، زمانہ ہمیں مارتا ہے یا زمانہ زندہ کرتا ہے۔

یہ حرکتیں جو ہو رہی ہیں آج دنیا میں یہ بھی خدا کے قوانین ہیں جو ایک قومی اجتماعی موت کے قوانین ہیں یہ ان کی طرف لے جا رہے ہیں اور ایسی حرکتیں کرنے والے نہیں زندہ رہا کرتے زیادہ دیر۔ لازماً یہ اپنی قبر کھود رہے ہیں خود آج نہیں تو کل اس میں گریں گے۔

تو ہمیں اپنے سال کا مطالعہ اس پہلو سے بھی کرنا چاہئے کہ کس حد تک ہم جن کی قومی زندگی کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کم سے کم ایک ہزار سال کا وعدہ کیا ہے کس حد تک ہم اس وعدہ کے مطابق اپنے قدم اُٹھا رہے ہیں، کس حد تک ہم وقت کو ضائع کر رہے ہیں ان کے ساتھ مل کر اور اپنے ذہنوں کو اندھا دھند بعض لوگوں کے غلام بناتے چلے جا رہے ہیں، کس حد تک ہم آزاد

ہیں ، اپنے وقت کے خود مالک ہیں، کس حد تک ہم حیثیت یہ رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کے وقت کا مصرف ان کو بتائیں اور ان کو اپنے وقت کا بہترین مصرف کرنے پر آمادہ کریں ذہنی طور پر۔ جتنا آپ ٹیلی وژن کے معاملے میں بے خوف ہوتے چلے جائیں گے اتنا زیادہ آپ کے اپنے وقت پر بھی آپ کے اختیارات کم ہوتے چلے جائیں گے، اپنی اولاد کے وقت پر اختیارات کم ہوتے چلے جائیں گے۔ پھر اس طرح چنگل میں پھنس جائے گی آپ کی اولاد کہ جب یہ بڑی ہوگی آپ کا کوئی اختیار نہیں رہے گا کہ ان کو واپس کھینچ کے لے آئیں۔

اس پہلو سے بھی اپنے گھروں میں باتیں کریں، جائزہ لیں مطالعے کی طرف توجہ دلائیں، خود مطالعہ کر کے ان کو بتائیں۔ آج اگر آپ جائزہ لیں سارے انگلستان کے خاندانوں کا تو آپ حیران ہوں گے یہ سن کر میں نے جائزہ نہیں لیا مگر مجھے پتہ ہے کہ یہی ہے کہ بھاری اکثریت خاندانوں کی ایسی ہے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کسی کتاب کا سال میں چند دن بھی مطالعہ نہیں ہوتا اور ایسے خاندان شاذ نظر آئیں گے جہاں ماں باپ مطالعہ میں اپنے بچوں کو شامل کر رہے ہیں ۔ بچوں کا جائزہ لینے والے کہ دینی کتابیں کونسی پڑھ رہے ہیں، کتنی پڑھتے ہیں؟ کتنے خاندان ہیں یہاں؟ انگلیوں پر گن کے بتایئے مجھے، چند ہیں گنتی کے۔ بھاری اکثریت یہی ہے جو وقت کی غلام بن کر ساتھ بہتی چلی جارہی ہے۔ حالانکہ مومن وقت کا خدا کی طرف سے مالک قرار دیا جاتا ہے، اپنے وقت کا ، اسی لئے اس سے جواب طلبی ہوتی ہے ۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جو عظیم الشان تاریخی کلمات جو خدا تعالیٰ نے فرمائے ان میں ایک یہ تھے اَنْتَ الشیخ المسیحُ الّذی لَایُضَاعُ وَقْتُہٗ (تذکرہ صفحہ: ۳۱۸) کہ اے معزز مسیح تو وہ شخص ہے جس کا وقت ضائع نہیں ہو رہا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت بھی دنیا کی بھاری اکثریت کا وقت بے شمار ضائع ہو رہا تھا اور ایک ایسا شخص خدا کو نظر آیا ہے جو حیرت انگیز تھا، جس کی کوئی مثال نہیں تھی اس دنیا میں یعنی ایک ایسا شخص جس کا وقت ضائع نہیں ہو رہا۔ تو آپ اس شخص کے غلام ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْتَ الشیخ المسیحُ الّذی لَا یُضَاعُ وَقْتُہٗ ایسی گواہی سو فی صدی آپ کے اوپر نہ بھی صادق آتی ہو دنیا کی نسبت سے تو نمایاں طور پر آپ کے حق میں صادق آنی چاہئے۔ کچھ وقت بے شک تھکاوٹ کے نتیجے میں آرام طلبی کی نظر کر دیں لیکن حتی المقدور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ وقت

بچائیں اعلیٰ مقاصد کی خاطر، اعلیٰ مقاصد کی پیروی کے لئے تا کہ آپ کی آئندہ نسلیں آزاد نسلیں پیدا ہوں اور دن بدن مغربیت خود اپنے داموں کی اسیر ہوتی چلی جارہی ہے اور دن بدن جو اجتماعی غلامیوں کے قبضہ میں جارہے ہیں یہ لوگ ان سے آپ تو آزاد رہیں کم سے کم۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً یہ بھی خبر دی ہے کہ تیرے غلام آزاد رہیں گے، آزاد رکھیں جائیں گے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس طرف ہمیں توجہ کرنی چاہئے۔ جس زمانے میں Masonry کا ابھی تعارف ہو رہا تھا دنیا میں، 1905ء میں پہلی دفعہ انگریزی زبان میں یہ کتاب ترجمہ ہوئی پروٹوکال آف ایلڈرز آف زائن (Protocol of Elders of Zion) یعنی Zionism جو ہے یہودیوں کی تحریک اس کے بڑے لوگوں نے اپنے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کیا ہے؟ دنیا کو اپنے چنگل میں لینے کے لئے۔ اس کتاب میں کھلے کھلے لفظوں میں وہ سارا پروگرام لکھا ہوا ہے۔ جس کے ذریعے ہم دنیا پر قبضہ کریں گے یعنی وہ یہود ایلڈرز کہتے ہیں ہم قبضہ کریں گے۔ اس میں یہ عیش پرستی کے نئے نئے سامان پیدا کرنا اور رفتہ رفتہ قوموں کو زندگی کے سنجیدہ چیزوں سے غافل کر کے ان بے ہودہ امور کی طرف متوجہ کرتے چلے جانا اور فضول وقت کے ضیاع کی طرف دنیا کی توجہ پھیر دینا، یہ سارے پروگرام کھلے کھلے لفظوں میں انہوں نے لکھے ہوئے ہیں اور جو بات کھولی ہے آخر پر وہ یہ ہے کہ ہم ان سب چیزوں کی پیروی کے لئے Freemasonry کو استعمال کریں گے اور فری میسنز کے ذریعے دنیا پر قبضہ کریں گے۔ عجیب بات یہ ہے Freemason کے متعلق بارہا مختلف ملکوں میں خطرات محسوس ہونے کے نتیجے میں تحریکات بھی چلی ہیں اس کو توڑنے کے لئے یا اس چنگل سے نکلنے کے لئے لیکن سب لوگ ناکام رہے ہیں۔ انگلستان میں ہی فری میسنری کے متعلق بعض کتابیں بھی شائع ہوئیں، ٹیلی وژن پر پروگرام آئے، دونوں طرف لوگوں کو موقع دیا گیا اور کھلم کھلا یہ بات ایک فریق نے ثابت کی کہ ہماری انگلستان کی زندگی میں فری میسنز کا اتنا قبضہ ہو چکا ہے کہ اس سے اب نکلنا مشکل ہو چکا ہے عرب دنیا فری میسنز کے قبضے میں جا چکی ہے تمام عرب خواہ کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں، الّا ماشاء اللہ کسی نہ کسی طرح فری میسنز سے تعلق رکھے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو 1905ء میں جب کہ یہ تذکرے چل رہے تھے کہ ہم آئندہ دنیا کو فری میسنز کے ذریعے اپنا غلام بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے (۱۹۰۱ء میں) الہاماً فرمایا ''فری میسن مسلط نہیں کئے جائیں

گے‘‘ (تذکرہ: ۳۳۶) اگر اس الہام کا عمومی مطلب لیں تو پھر تو یہ خبر نعوذ باللہ غلط نکلی کیونکہ ساری دنیا پر فری میسنز مسلط ہو چکے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو الہام کیا گیا وہ آپ کی جماعت کے متعلق تھا اور یہ وعدہ تھا فری میسن تم پر مسلط نہیں کئے جائیں گے۔ ساری دنیا ان کی غلام بن جائے گی تم آزاد مسیح ہو تمہارے وقت پر میں فری میسن کا قبضہ نہیں ہونے دوں گا۔

اس الہام کی روشنی میں ہی جماعت کو اپنا پروگرام مرتب کرنا چاہئے اور ہر اس دجال کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جس میں رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر خود بخود ہماری نسلیں ان کی غلام بنتی چلی جارہی ہیں، کچھ تو دنیا میں ایسے ہوں جو آزاد ہوں سوائے خدا کے کسی اور کی غلامی میں وہ سر نہ جھکاتے ہوں اور آپ نے چونکہ دنیا کو آزاد کرانا ہے اس لئے بہت ہی ذمہ داری ہے۔ تو اس سال کے آخر پر اس لحاظ سے اپنے گزشتہ سال کا جائزہ لیں کہ آپ نے اور آپ کے بچوں نے اپنے آپ کو آزاد رکھنے کی کیا کوشش کی، اپنے وقت کو بہترین مصرف میں استعمال کرنے کی کیا کوشش کی، سنجیدہ کتابوں کے مطالعہ کی طرف کیا توجہ کی، آئندہ کے لئے اس روشنی میں کیا پروگرام مرتب کرنا چاہئے جس سے ہم آئندہ سال فائدہ اُٹھائیں اور سال کے آخر پر پھر جائزہ لیں کہ کس حد تک ہم اس میں کامیاب ہوئے۔ ان امور کی طرف اپنے گھروں میں مجالس لگا کر توجہ کریں، جس طرح جماعت کی مجالس عاملہ بیٹھی ہوں گی۔ اس طرح اب احمدی گھروں میں یہ تذکرے چلیں تا کہ آپس یہ میں باتیں کریں گے تو پھر دماغ اور زیادہ کھلیں گے اور روشن ہوں گے اور خیالات نشو ونما پائیں گے۔ اکیلا بیٹھا آدمی بعض دفعہ اتنی سنجیدہ باتیں نہیں سوچ سکتا۔ اکیلا سوچنے کی کوشش کرے تو بعض دفعہ بور بھی ہو جاتا ہے اور نیند بھی اس کو جلدی آجاتی ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں مجالس میں موضوع سخن بنائیں، ان پر گفتگو کریں اور پھر بچوں کو ساتھ شامل کریں۔ ان کو سمجھائیں کہ یہ سنی ہیں ہم نے باتیں جن کی روشنی میں ہمیں آئندہ کے لئے کچھ کرنا چاہئے تم کس حد تک تعاون کرو گے، کس حد تک ہم پروگرام کو بدلیں کہ زندگی کی لذتیں جو جائز ہیں وہ بھی حاصل کریں مگر اپنے وقت کو ضائع نہ ہونے دیں گے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ (آمین)